(غلام گردش)

سماجی کوڑھ موجود ہے!

1999 کا ذکر ہے۔ جاوید اقبال نام کے ایک شخص نے لاہور میں ایک اخبار کے ایڈیٹر کو خط لکھا۔ خط کے مندرجات لرزہ خیز تھے۔ درج تھا کہ میں نے ایک سو بچوں کے ساتھ زیادتی کر کے انہیں قتل کیا ہے۔ انکی عمر 8 سال سے لیکر پندرہ سولہ سال کی تھی۔ موت کے گھاٹ اُتارنے کے بعد، انکی لاشوں کو تیزاب کے کے ڈرموں میں ڈال دیتا تھا۔ گوشت اور ہڈیاں گل سڑ جاتی تھیں۔ اسکے بعد انکے بقیہ حصوں کو دریا برد کر دیتا تھا۔ متعدد بار تو دریا میں چھپانے کی ضرورت بھی نہیں پڑتی تھی۔ ہائیڈروکلورک ایسڈ پورے جسم کو محلول میں بدل دیتا تھا۔ اسکے بعد محلول کو بڑے آرام سے نالیوں میں بہا دیا جاتا تھا۔ ایڈیٹر کو یقین نہ آیا۔ اسے لگا کہ یہ کوئی دیوانہ انسان ہے اور اہمیت حاصل کرنے کیلئے خط لکھا ہے۔ اسطرح کا واقعہ ہو ہی نہیں سکتا۔ بہر حال ایڈیٹر نے یہ تمام جزئیات پولیس کو بتائیں۔ جب پولیس اس پتہ پر پہنچی تو معلوم ہوا کہ یہ تو ایک بھرپور مقتل گاہ ہے بلکہ مذہبہ خانہ ہے۔ گھر کے اندر سخت ترین تیزاب کے ڈرم پڑے ہوئے تھے۔ کمروں میں زنجیریں لگی ہوئی تھیں۔ دیواروں پر خون کے بھرپور دھبے موجود تھے۔ اسکے علاوہ جابجا مقتولین کے نام بڑی صفائی سے لکھے ہوئے تھے۔ پورے گھر کی ایک ایک اینٹ چیخ چیخ کر بتا رہی تھی کہ یہاں ظلم، زیادتی کے دلخراش واقعات مسلسل ہوتے رہے ہیں۔ درج شدہ تمام نام گمشدہ بچوں کے تھے۔ تفتیش ہی میں معلوم ہوا کہ گمشدہ بچے پورے پاکستان سے کسی نہ کسی طرح لاہور پہنچتے تھے۔ یہاں درباروں اور گلیوں میں بسیرہ کر لیتے تھے۔ جاوید اقبال اور اسکے تین ساتھی، انہیں بہلا پھسلا کر گھر لے آتے تھے۔ اسکے بعد زنجیروں سے باندھ کر اجتماعی زیادتی کرتے تھے۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد انہیں سفاک طریقے سے قتل کر دیا جاتا تھا۔ لاش کو بھی تیزاب کے ڈرم میں ڈال کر ختم کر دیا جاتا تھا۔ اسی جرم کے متعلق ثبوت دینے کیلئے جاوید نے گھر کے صحن میں تیزاب کے دو ڈرم رکھے ہوئے تھے اور ان میں بچوں کے اعضاء اور لاشیں موجود تھیں۔ پورے ملک میں قیامت برپا ہو گئی۔ گمشدہ بچوں کے والدین، اپنے پیاروں کی تلاش میں لاہور آنا شروع ہو گئے۔ جاوید کے گھر کی دیواروں پر اپنے لختِ جگر کا نام پڑھتے تھے۔ گریہ اور نوحہ کرتے تھے اور پھر اپنی قسمت کا لکھا جان کر واپس چلے جاتے تھے۔ اس وقت آزاد میڈیا کو تو خیر کوئی تصور نہیں تھا۔ مگر تمام اخبارات اس سانحہ کو اُجاگر کر رہے تھے۔ قاتلوں کا ایک ساتھی، سوحاوا سے گرفتار ہوا۔ اس نے اقبال جرم کیا۔ مگر تھانے میں موقعہ پا کر خودکشی کر لی۔ اسے قتل کیا گیا یا خود اپنے آپکو مار دیا اسکے متعلق کچھ بھی کہنا ممکن نہیں۔ ایک ماہ گزر گیا مگر جاوید اقبال گرفتار نہ ہو سکا۔ زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا، کسی کو کچھ معلوم نہ تھا۔ پوری حکومت، اپنے بھرپور وسائل استعمال کرنے کے باوجود اسے گرفتار نہ کر سکی۔

پھر ایک دن، جاوید اقبال بذاتِ خود لاہور میں ایک اخبار کے دفتر میں پہنچا اور وہاں اپنا تعارف کروایا۔ کسی نے پوچھا بھی، کہ تم اخبار کے دفتر میں گرفتاری دینے کیوں آئے ہو۔ جواب تھا کہ خوف ہے کہ اگر میں تھانہ چلا گیا تو پولیس مجھے فوراً گرفتار کرتی اور قتل کر دیتی۔ خیر پولیس نے جاوید کو اخبار کے دفتر پہنچ کر گرفتار کر لیا۔ حراست میں ہولناک انکشاف کیے۔ ایک تو یہ کہ کیسے، اسکا گروہ لاوارث اور بھٹکے ہوئے بچوں کو ٹریپ کرتا تھا۔ کس کمال عیاری سے انہیں اپنے گھر لیکر آتا تھا اور اسکے بعد کس طرح ایک شیطانی کھیل

کھیلا جاتا تھا۔جسکا انجام اس بچے کے قتل پر ہوتا تھا۔جاوید کو ہرگز یہ یاد نہ تھا کہ اس نے کتنے پھول مسلے ہیں۔کتنے چراغ گل کیے ہیں۔پولیس بھی صرف قیافہ لگا سکتی تھی۔ابتدائی معلومات کے مطابق یہ تعداد سو کے قریب تھی۔ہاں،ایک نشان یہ گروہ ضرور چھوڑتا تھا۔مقتول بچوں کی چپلیں،سلیپر اور جوتے،گھر کے ایک کونے میں پڑے ہوئے تھے۔متعدد والدین نے اپنے بچوں کو جوتوں سے پہچانا۔گھر میں جوتے کیوں چھوڑ دیتا تھا،اسکی وجوہات بالکل سامنے نہیں آئیں۔جاوید پر مقدمہ چلا اور اسے پھانسی کی سزا ہوئی۔حکم میں یہ بھی درج تھا کہ اسکی لاش کو سو حصوں میں تقسیم کیا جائے۔انہیں تیزاب میں محلول کر دیا جائے۔مگر اسکی نوبت ہی نہیں آئی۔جاوید جیل ہی میں مر گیا۔قتل کیا گیا یا اس نے خودکشی کر لی۔اس میں مکمل ابہام تھا اور ہے۔جاوید کے اس قبیح کام میں کس کس کی پشت پناہی حاصل تھی۔اسکا بھی کچھ پتہ نہیں چل سکا۔کچھ عرصہ گزرا اور ہر چیز جوں کی توں رواں دواں ہوگئی۔ہر طرف خاموشی چھا گئی۔کوئی اس خوفناک جرم کا ذکر تک نہیں کرتا تھا۔بین الاقوامی میڈیا نے جاوید اقبال کو ''سیریل کلر'' (Serial Killer) قرار دیا اور آج تک اسے کیس سٹڈی کے طور پر یاد رکھا جاتا ہے۔مگر آج کم از کم ہمارے ملک میں کسی کو بھی یہ سب کچھ یاد نہیں ہے۔ہوسکتا ہے جنکے بچے مارے گئے،وہ آج بھی اشکبار ہوں۔مگر ملک کے مزاج کے مطابق،یہ واقعہ دھیرے دھیرے فراموش کر دیا گیا۔اس المناک واقعہ سے کسی نے کوئی سبق نہیں سیکھا۔سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر کوئی ایسی پالیسی ترتیب نہیں دی گئی جس سے ان واقعات کا سدِ باب کیا جاسکے۔یہ ہمارے سسٹم کی مکمل ناکامی تھی اور ہے۔

بالکل اسی طرح،2017 کے آخر میں،قصور میں زینب کیس ہوا۔زینب کے والدین عمرہ کرنے سعودی عرب گئے ہوئے تھے۔انکی سات سالہ بیٹی زینب،ایک قریبی عزیز کے گھر رہ رہی تھی۔قرآن پاک پڑھنے کیلئے محلّہ میں ایک جگہ جا رہی تھی،کہ ایک شخص نے اغوا کر لیا۔چھ سات دن کے بعد بچی کی لاش کوڑے کرکٹ کے ایک ڈھیر سے برامد ہوئی۔قاتل پکڑا گیا۔اسکا نام عمران علی تھا۔میڈیا رپورٹ کے مطابق زینب کے ساتھ زیادتی کی گئی اور پھر اسے قتل کر دیا گیا۔آپ ستم دیکھیے،کہ عمران علی یعنی قاتل،زینب کیلئے انصاف مانگنے والے جلوسوں میں بھرپور طریقے سے شرکت کرتا رہا۔بہرحال گرفتار ہونے کے بعد،تحقیقات میں سامنے آیا کہ اس نے پہلے،کم از کم آٹھ بچے اور بچیوں کو بالکل اسی طرح زیادتی کے بعد قتل کیا ہے۔پورے ملک میں کہرام مچ گیا۔ہر بڑے آدمی نے روایتی طور پر رنج اور دکھ کا اظہار کیا۔عمران پر مقدمہ چلا اور سزائے موت سنائی گئی۔2018 میں ہی پھانسی دیدی گئی۔مگر اسکے بعد،پھر سب کچھ معمول کی طرح رواں دواں رہا۔ہر کوئی،اپنی زندگی میں مصروف ہوگیا۔زینب اور اسی طرح کے نوخیز پھولوں کے ساتھ جو کچھ ہوا،وہ سب کچھ وقت کی ریت تلے غائب ہوگیا۔کسی سطح پر کوئی پالیسی ترتیب نہیں دی گئی کہ مستقبل میں ان اندوہناک واقعات سے بچا جائے۔چند دن پہلے دوبارہ،قصور کے نزدیک چونیاں میں چار بچے غائب ہوگئے۔آٹھ سالہ فیضان کی لاش کوڑے کرکٹ سے مل گئی۔میڈیکل رپورٹ کے مطابق اس بچے کو بھی زیادتی کا نشانہ بنا کر قتل کیا گیا تھا۔آٹھ سالہ علی حسین اور نو سالہ سلیمان کے جسم کے اعضاء بالکل اسی طرح مختلف کھیتوں سے برامد ہوئے۔قاتل کون ہیں،کچھ معلوم نہیں۔مگر یہ بات پوسٹ مارٹم رپورٹوں سے واضح ہوئی ہے کہ ان بچوں کو زیادتی کا نشانہ بنا کر،قتل کیا گیا ہے۔ہاں،مگر روایتی بیان بازی جاری ہے۔پہلے،شہباز شریف صاحب نوٹس لیتے تھے۔اب،عثمان بزدار صاحب

نے اس واقعہ کا فوری نوٹس لے لیا ہے۔اشک شوئی کیلئے حسبِ معمول، چند سیاستدان بھی مقتول بچوں کے گھر تشریف لے گئے ہیں۔کئی فوٹوسیشن ہو چکے ہیں۔ماضی کی روایات کے عین مطابق،این جی اوز اور فعال لوگ احتجاج کر رہے ہیں۔چند دن تک یہ معاملات اسی طرح چلیں گے۔شائد قاتل گرفتار ہو جائے اور پھر سزا و جزا کا معاملہ چل نکلے۔مگر آج تک کسی چینل یا اخبار میں یہ پڑھنے یا دیکھنے کو نہیں ملا کہ یہ سب کچھ کیا ہے اور تسلسل سے کیوں جاری ہے۔

دراصل ہم اپنے ملک میں کئی شرمناک حقیقتوں کا اعتراف نہیں کرتے۔بچوں کے ساتھ زیادتی اس میں ایک ہے۔میڈیکل کی زبان میں اسے Pedophilia کہا جاتا ہے۔اسکے مریض پوری دنیا میں موجود ہیں۔ہمارے ملک میں بھی ہیں۔یہ لوگ طرح طرح کی ذہنی مشکلات کا شکار ہوتے ہیں۔مریضوں میں ڈپریشن، ذہنی تناؤ، عزتِ نفس کا ختم ہو جانا پایا جاتا ہے۔وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ ذہنی مشکلات، کسی بھی شخص کو بچوں سے زیادتی کرنے پر آمادہ کرتی ہیں یا یہ مسئلہ اُلٹ ہے۔بنیادی طور پر یہ ایک نفسیاتی بیماری ہے۔ماہر ترین ماہر نفسیات اور ڈاکٹر تحقیق کرنے کے بعد بتاتے ہیں کہ اس نفسیاتی بیماری کا کوئی مستند علاج نہیں ہے۔پہلی بات تو یہ کہ کوئی شخص تسلیم ہی نہیں کرتا کہ اسے یہ مرض لاحق ہے۔اگر معلوم ہو جائے تو مغربی ممالک میں سائیکوتھراپی اور ماہرین نفسیات کے ساتھ سیشن کے ساتھ معمولی سا علاج موجود ہے۔وہاں، ایک بات ضرور ہے۔اگر پتہ چل جائے کہ کوئی شخص Pedophila ہے، تو اسکی کڑی ترین نگرانی کی جاتی ہے۔اسے بچوں سے دور رکھنے کی سر توڑ کوشش کی جاتی ہے۔ہمارے ہاں، تو کسی سطح پر یہ اعتراف ہی موجود نہیں ہے کہ یہ نفسیاتی مرض بھرپور طریقے سے ملک میں موجود ہے۔جب ہم ایک اَمر کا انکار کر رہے ہیں تو اسے ٹھیک کیسے کرینگے۔پاکستان کے ہر طول و عرض میں بچوں کے ساتھ روزانہ کی بنیاد پر زیادتی ہوتی ہے۔کبھی میڈیا اسے سب کے سامنے لے آتا ہے۔مگر ننانوے فیصد واقعات، خاموشی سے دبا دیے جاتے ہیں۔کسی کو بھی نہیں بتایا جاتا کہ ہمارے بچے یا بچی کے ساتھ کیا ہوا ہے۔گھر کی عزت کو برقرار رکھنے کیلئے جھوٹ بولا جاتا ہے۔کسی سطح پر بھی ان محرکات کو سامنے نہیں لایا جاتا جو اس جرم کا باعث بنتے ہیں۔ویسے اگر پولیس کو بتا بھی دیا جائے تو پھر بھی اسکا کوئی مثبت نتیجہ نہیں نکل سکتا۔اس مرض کا ادراک اور شعور بہر حال ہر سطح پر ہونا چاہیے۔چلیے، سخت سزائیں بھی اسکا قانونی سا سدِ باب ہیں۔مگر جن حالات میں ہم زندگی گزارنے پر مجبور ہیں، اس میں بچت کا ایک ہی راستہ ہے۔اپنے بچوں اور بچیوں کی خود حفاظت کریں اور بھرپور طریقے سے کریں۔ہر ممکن طریقے سے کریں۔یہ سماجی کوڑھ ہمارے معاشرے میں مضبوط طریقے سے موجود ہے۔شائد بلا تعطل موجود بھی رہیگا!

راؤ منظر حیات